ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
editor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.7,Issue No.2 (2025)
(July to September)

"خدا کی بستی" کے کرداروں کا نفسیاتی مطالعہ

Psychological Study of the Characters in *"Khuda Ki Basti"*

ڈاکٹر صبا علی
لیکچرر، شعبہ اُردو، کلام بی بی انٹر نیشنل ویمن انسٹیٹوٹ، بنوں
ڈاکٹر رقیہ بانو
لیکچرر، شعبہ اُردو، کلام بی بی انٹر نیشنل ویمن انسٹیٹوٹ، بنوں

Dr. Saba Ali
Lecturer, Department of Urdu, Kalam Bibi International Women Institute, Bannu
Dr.Ruqia Bano
Lecturer, Department of Urdu, Kalam Bibi International Women Institute, Bannu

Abstract:
According to Matthew Arnold, literature is "the criticism (or reflection) of life." Thus, literature becomes limitless within it, every aspect or point of life can be expressed. In this way, the science of psychology directly or indirectly studies a person's inner states, mental experiences, and external actions and behaviors. The true center and focus of the universe is the human being. Hence, psychology takes the human self and its behavior as its subject the human, as a living being, acts within this ever-changing world and constantly responds to the shifting phenomena and events around them.In his novel "Khuda Ki Basti", Shaukat Siddiqui has depicted the semi-feudal and capitalist society that emerged in Pakistan after the partition of India through the characters and has boldly described its inner realities, how fraud and lust were being promoted under the guise of democracy and religion. It has successfully portrayed such a deceptive society in the mirror of reality.

Keywords: Matthew Arnold, psychology, Khuda Ki Basti, semi-feudal, inner realities, deceptive society, mirror of reality

تاریخی شعور اور سائنسی طرز فکر کے دباؤ سے آزاد ہو کر تخلیقی عمل کے بیان کو ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح ادب زندگی کے بارے میں فرد واحد کے جذبات واحساسات، تجربات ومشاہدات کا مؤثر اور خوبصورت انداز میں تحریری بیان ہے۔ جب کہ میتھوار نلڈ نے ادب کو زندگی کا ترجمان کہا ہے۔ اس طرح ادب لامحدود بن جاتا ہے اور اس میں زندگی کا کوئی بھی نقطہ بیان کیا جاسکتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید:

> "فنون لطیفہ میں سے ادب ایک ایسا آزاد عمل ہے۔ جو زندگی کے کسی ایک جزو کو گرفت میں نہیں لیتا بلکہ اس کے "کل" کو دائرہ نور میں لانے کی کوشش کرتا ہے۔"[1]

اس طرح نفسیات کا علم انسان کی اندرونی کیفیات، ذہنی واردات اور اس کے خارجی اعمال وافعال کا براہ راست یا بالواسطہ مطالعہ کرتا ہے۔ کائنات کا اصل محور اور دلچسپی کا مرکز انسان کی ذات ہے۔ چنانچہ علم نفسیات انسان اور اس کے کردار کو موضوع بناتا ہے۔ جو ایک جاندار کی حیثیت سے اس تغیر پذیر دنیا میں عمل پیرا ہوتا ہے اور ہر آن بدلتے ہوئے مظاہر اور واقعات کا جوابی عمل (response) ظاہر کرتا ہے۔ ۲

شوکت صدیقی نے اپنے ناول "خدا کی بستی" میں کرداروں کے ذریعے تقسیم ہند کے بعد پاکستان میں بننے والی نیم جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشرت کی عکاسی کی ہے اور اس کے باطنی حقائق کو نہایت جرات کے ساتھ بیان کیا ہے کہ کس طرح جمہوریت اور مذہب کو آڑ بنا کر دھوکہ دہی اور ہوس پرستی کو شعار بنایا جارہا تھا۔ ایسے پُر فریب معاشرے کو حقائق کے آئینے میں بیان کرنے کی کامیاب تصویر کشی کی ہے۔ شوکت صدیقی نے اپنے ناول "خدا کی بستی" میں سماج اور انسانی نفسیات کا تجزیہ اتنے حقیقی انداز میں کیا ہے کہ کہانی حقیقی زندگی کا عکس معلوم ہوتی ہے۔ کوئی بھی کردار ہمیں اجنبی معلوم نہیں ہوتا۔ تمام کردار فطری معلوم ہوتے ہیں اور ہمارے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ عبداللہ جاوید "خدا کی بستی" کے کرداروں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "خدا کی بستی کے کردار راجہ، نوشا، انو، شامی، سلطانہ، سلطانہ کی ماں، نیاز، سلمان، ڈاکٹر خیرات محمد، شاہ جی، صفدر بشیر، ڈاکٹر زیدی، پروفیسر کلیم اللہ، نادرہ، استاد پیڈرو صرف ناول ہی میں نہیں ملتے بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستان کے مستقل شہری ہیں اور ہمارے اردگرد زندگی گزارنے میں مصروف ہیں۔"(۳)

"خدا کی بستی" کے تمام کردار سماجی وطبقاتی مسائل اور نفسیاتی اُلجھنوں سے دوچار نظر آتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے ناول کے ابتداء میں غریب محلے میں رہنے والے بچوں کی نفسیاتی وذہنی کش مکش کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

> "محلے کے کچھ نوعمر لڑکے بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان میں سب سے بڑا راجہ تھا۔ وضع قطع سے وہ آوارہ گرد اور لفنگا نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے الجھے ہوئے بال، پھٹی ہوئی بوسیدہ قمیص اور گلے میں بندھا ہوا میلا کچیلا ریشمی رومال۔ ملی جلی آوازوں کے شور میں وہ بار بار چیخ کر کہتا۔ "کہو استاد! کیسا بیمہ کیا؟" "اے یہ رہی بیگنی۔ واہ میری جان، میں تیرے قربان۔ "سالو! آج تم کو پد اماروں گا۔"(۴)

شوکت صدیقی نے ناول کے آغاز میں جس آوارہ اور لفنگے لڑکے کی تصویر کھینچی ہے وہ راجہ ہے۔ راجہ اپنے ساتھیوں میں عمر میں کچھ بڑا دنیاشناس اور ڈیل ڈول میں نکلتا ہوا ہے۔ وضع قطع، طور طریقے اور بات چیت سے وہ خاصا بگڑا ہوا نظر آتا ہے۔ راجہ اس کہانی کا ایک لازوال کردار ہے۔ دہلی میں اپنے گھر والوں کے قتل کے بعد یہ اپنی ماں کے ساتھ پاکستان ہجرت کر کے آجاتا ہے۔ یہاں راجہ کی ماں اس کو یتیم خانے میں ڈال کر خود لاہور میں جسم فروشی کا دھندا کر کے زندگی گزارتی ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جس یتیم خانے میں راجہ کو ڈالا گیا تھا وہاں بے سہارا اور یتیم بچوں سے بھیک منگوائی جاتی تھی۔ ایک دن جب راجہ پیسے کم لایا تو اس ادارے کے سربراہ نے اس کو اتنا مارا کہ وہ رات کی تاریکی میں وہاں سے فرار ہوگیا۔ یتیم خانے سے بھاگنے کے بعد وہ ایک ٹوٹی پھوٹی تنگ وتاریک کھولی میں ایک گداگر کے ساتھ رہنے لگا۔ یہاں گداگر کی دستگیری اور مدد کرنے کے بدلے میں اسے ایک اٹھنی معاوضے کے طور پر ملتی ہے۔ صبح سے لے کر شام تک وہ گداگر کی گاڑی کھینچتا ہے اور شام کو فرصت ملنے پر اپنے دوستوں کے ساتھ تاش کھیلنے، آوارہ

گردی کرنے، فلم دیکھنے یا کالے خان کے اڈے پر جوا کھیلنے چلا جاتا ہے۔ یہ ان کی زندگی کا معمول بن گیا تھا۔ اپنی قسمت کو بدلنے اور شرافت سے محنت مزدوری کر کے روٹی کمانے کے لئے راجہ کراچی چلا جاتا ہے۔ لیکن یہاں وہ غلط لوگوں کے ہاتھوں چڑھ جاتا ہے اور ایک ڈاکو سے دوسرے ڈاکو کے ہاتھوں کا آلہ کار بن جاتا ہے۔ اس کی زندگی میں کہیں بھی سکون کا لمحہ میسر نہیں آتا۔ اس لئے وہ اس ماحول سے سخت نفرت کرتا ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنی بے بسی کے بارے میں سوچتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر ماں برائی کا راستہ اختیار نہ کرتی تو میں بھی گھر سے بے گھر نہ ہوتا۔

راجہ بظاہر ایک لاپرواہ اور لاأبالی لڑکا ہے۔ لیکن اسے اپنی قسمت کی خرابی کا بھی شدید احساس ہے۔ وہ اپنی بدنصیبی کی وجہ سے نفسیاتی توڑ پھوڑ کا اس قدر شکار ہو جاتا ہے کہ وہ خودکشی جیسے قبیح فعل سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ وہ دریا کے پانی میں ڈوب کر جان دینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کا دوست نوشا اس کی اس کوشش کو ناکام کر دیتا ہے:

> "لہروں کے شور میں راجہ کی آواز اُبھری۔ وہ کہہ رہا تھا، "یار جی چاہتا ہے، مر جاؤں۔" نوشا نے سہمی ہوئی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ اس کی گردن دیوار سے ٹکی تھی۔ آنکھیں آسمان کی جانب تھیں اور ٹانگیں دریا کی طرف لٹک رہی تھیں۔۔۔۔ راجہ لمحہ بھر خاموش رہ کر بولا۔" سالی اس زندگی میں رکھا ہی کیا ہے۔"۔۔۔ نوشا نے جھپٹ کر اسے دونوں ہاتھوں سے دبوچ لیا۔ گھبرا کر بولا۔" یار اجہ تجھے ہو کیا گیا؟"(۵)

جان بچ جان پر بھی راجہ کو کوئی خوشی نہیں ہے۔ وہ نوشا سے کہتا ہے:

> "یار تو نے ناحق رک لیا۔ مر جاتا تو اچھا تھا۔ میرے مرنے سے کسی کو دکھ نہ ہوتا۔ کوئی نہ روتا، میرا بیٹھا ہی کون ہے۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بھائی، نہ بہن، کوئی بھی نہیں۔" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔"(۶)

راجہ اگرچہ ایک گمراہ لڑکا ہے اس کی ذات میں معاشرے کی تمام تر برائیاں موجود ہے۔ لیکن شوکت صدیقی نے اس کی ذات میں موجود برائیوں کو کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ قارئین کو راجہ سے ہمدردی و محبت کا جذبہ محسوس ہوتا ہے اور اس کی مصیبتوں اور مجبوریوں سے متاثر ہوتے ہیں۔ اقدام خودکشی کے بعد قاری راجہ سے ایک جذباتی قربت سی محسوس کرتا ہے۔ نفسیاتی طور پر بھری دنیا میں تنہا ہونے کا دکھ اس وقت شدید ہوتا ہے۔ جب اپنوں کے ہوتے ہوئے اس سے ملنے کو دل نہ کرے۔ راجہ کی ماں بھی زندہ ہے لیکن اس کے لیے ماں کا وجود ناسور کی طرح ہے۔ وہ ماں جیسے مقدس رشتے سے متنفر ہے۔ اقتباس:

> "یہ مائیں تو سالیاں سب ایک نمبر حرام کی جنی ہوتی ہیں۔ اب میری ہی ماں کو دیکھ۔ سنا ہے بہت ٹھاٹھ سے لاہور میں رہتی ہے اور میں یہاں بھیک مانگتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے دکھ کا گہرا سایہ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔"(۷)

تمام تر بری عادتوں میں مبتلا ہونے کے باوجود راجہ ایک خوددار اور وفادار لڑکا ہے۔ وہ ہر طرح کے نامساعد حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ شاہ جی کے کہنے پر جب راجہ کو انجنیئر صاحب کی کوٹھی میں نوکری مل جاتی ہے۔ تو اس گھر کے پُرخلوص اور محبت بھرے ماحول کو دیکھ کر راجہ کے فطری جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ ان ہی کا وفادار بن جاتا ہے۔ اس لئے جب شاہ جی کا گروہ اس گھر میں راجہ کے توسط سے چوری کر لیتے ہیں اور راجہ کو قید کر لیتے ہیں۔ تو راجہ شاہ جی کی قید سے فرار ہو کر انجنیئر صاحب کے

گھر معافی مانگنے چلا جاتا ہے۔ وہ ان سے معافی مانگتا ہے اور یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی ایمانداری کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں لیکن بد قسمتی سے وہ لوگ اسے معاف نہیں کرتے اور اسے جیل بھیج دیتے ہیں۔ جیل میں لڑائی کے دوران اسے چوٹ لگ جاتی ہے اور وہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ کوڑھیوں کے ہسپتال میں اس کی ٹانگ کاٹ دی جاتی ہے اور اس کو وہاں سے بھی نکال کر فٹ پاتھ پر ڈال دیا جاتا ہے۔ جہاں وہ بقیہ زندگی بھیک مانگتے ہوئے گزارتا ہے۔ اقتباس:

"نوشا نے غور سے گداگر کے چہرے کو دیکھا اور تکلیف سے کانپ اٹھا۔ یہ راجہ تھا۔ اس کی دونوں آنکھیں بند تھیں۔ سکڑا سکڑایا جسم کسی سڑتی ہوئی لاش کی طرح گھناؤنا نظر آرہا تھا۔ نوشا نے گہری سانس بھری اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا۔ قدموں کی آہٹ پا کر راجہ نے ایک دردناک صدا بلند کی۔ اس کے بدن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ جگہ جگہ پھنسیاں تھیں جن سے رطوبت بہہ رہی تھی۔"(۸)

ہمارے معاشرے میں ایسے لاتعداد بچے موجود ہیں۔ جو تنگ دستی وافلاک کے مارے ہوئے ہیں اور معاشرہ انہیں تحفظ فراہم نہیں کرتا۔ ان بچوں کو کھیلنے کودنے کے دنوں میں یا تو مزدوری پر لگا دیا جاتا ہے یا آوارہ گردی کے لئے انہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ان کی بہتر زندگی کے بارے میں کوئی نہیں سوچتا اور یوں یہ بچے خس وخاشاک کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ راجہ بھی ہمارے معاشرے میں موجود ان بچوں کی نمائندگی کر رہا ہے۔ جو والدین کی شفقت ومحبت سے محروم ہیں۔ محرومیاں، دردر کی ٹھوکریں اور غربت جن کا مقدر ہے۔ جو ناداری اور مفلسی میں آنکھ کھولتے ہیں اور بے چارگی، بیماری اور تنہائی میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مار جاتے ہیں۔

نوشا ایک بدنصیب نوجوان ہے۔ بچپن میں اس کے والد وفات پا گئے ہیں۔ وہ غربت کی وجہ سے بے بس اور ستائی ہوئی ماں کی توجہ اور محبت سے محروم ہے۔ نوشا کی ماں اور بہن بیڑیاں بنا کر گھر کا خرچہ چلاتی ہیں۔ وہ نیاز جیسے مفاد پرست انسان کے گھر میں کرایے پر رہتے ہیں لیکن قلیل آمدنی کی وجہ سے باقاعدگی سے کرایہ ادا نہیں کرتے۔ جس کے بدلے میں آئے دن نیاز کی جھڑکیاں، گالیاں اور مکان خالی کر دینے کی دھمکیاں سننے کو ملتی ہے۔ نوشا عبداللہ مستری جیسے ظالم اور سفاک انسان کے ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ جو اپنے کاریگروں کو سخت ترین سزائیں دینے کے لئے مشہور ہے۔ ورکشاپ میں نوکری کر کے اس کو جو پیسے ملتے ہیں وہ اسے اپنی بیوہ ماں کو دیتا ہے۔ نوشا نے تنگ دستی اور غربت میں آنکھ کھولی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ محبت اور آسائشوں کی کمی کی وجہ سے محرومیوں، زیادتیوں اور عدم توجہ کا شکار ہے۔ سر پر والی وارث نہ ہونے کی وجہ سے وہ غربت وافلاس کی تلخیوں کو کم کرنے کے لئے کبھی کبھی اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے، شراب پینے اور جوا کھیلنے چلا جاتا ہے۔ نوشا اپنی سادگی اور معصومیت کی وجہ سے دوسروں کے بہکاوے میں جلدی آجاتا ہے۔ اس لیے نیاز کباڑی بہلا پھسلا کر ان میں چوری کی عادت ڈال دیتا ہے۔ نیاز ایک ماہر نفسیات کی طرح نوشا کی خواہشوں کو ان کے سامنے بیان کر کے ان کو چوری کرنے کے لئے قائل کرتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"موقع لگے تو کبھی کبھار کوئی پرزہ یا اوزار اُڑا دیا کر۔ اس سالے پاپی کا مال کھانا تو ثواب کا کام ہے۔ نوشا اس کی بات سن کر چونکا۔ گھبرائی ہوئی نظروں سے نیاز کا منہ تکنے لگا۔ نیاز کہتا رہا۔ کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔ بس سیدھا یہاں آجایا کر۔ چائے پانی کا خرچہ نکل آئے گا۔ میں نے سنا ہے تجھے تو فلم دیکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔"(۹)

یوں نوشا نیاز کے بہکاوے میں آکر عبداللہ مستری کے ورکشاپ سے اوزاروں کے پُرزے چرانے لگتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ عبداللہ مستری پکڑے جانے پر سفاک سزا دے گا وہ چوری کے اس قبیح دلدل میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ چوری پکڑے جانے پر عبداللہ نوشا کو اذیت ناک سزا دینے کے بعد کام سے نکال دیتا ہے:

> "عبداللہ نے اس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں اس طرح آپس میں پھنسائیں کہ انگلیاں ہتھیلیوں کے اندر ہی رہیں۔ اس کے بعد اس نے تلوؤں کے نیچے فرش پر دو میخیں گاڑ دیں جن کے نکیلے سرے اوپر اُبھرے ہوئے تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ڈپٹ کر کہا۔ دیکھ بے ہاتھ چھوڑے تو سمجھ لینا سالے دونوں میخیں پوری اندر اتر جائیں گی۔ نوشا نے جھک کر میخوں کو دیکھا تو سہم کر رہ گیا۔"(۱۰)

ورکشاپ سے نکالے جانے کے بعد وہ سارا دن آوارہ گردی کرتا۔ نوشا کی اس آوارہ گردی اور بے روزگاری سے تنگ آکر ایک دن اس کی ماں نے بھی اس کو ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا۔ یوں اس کسمپرسی سے تنگ آکر نوشا راجہ کے ساتھ کراچی چلا گیا تاکہ وہاں سکون سے دو پیسے کما کر زندگی کی نئی شروعات کر سکے۔ لیکن بد قسمتی سے کراچی آکر بھی وہ غلط لوگوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے اور انجنیئر کی کوٹھی سے چوری کے جرم میں جیل چلا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات پوکر نامی جیب کترے سے ہو جاتی ہے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد پوکر اور استاد پیڈرو اس کو جیب کترا بنا دیتے ہیں۔ بچپن سے ہی معاشرتی جبر و ستم کا شکار ہونے کی وجہ سے وہ اپنے عقل و شعور کا استعمال صحیح سے نہیں کرتے۔ اس لئے استاد پیڈرو کے گروہ سے نکل جانے کے بعد جب اس کو زندگی میں عزت کے ساتھ روزی روٹی کمانے کا موقع مل جاتا ہے۔ تو وہ اسے بھی اپنے ہاتھوں سے گنوا دیتا ہے۔ جب کتروں کے گروہ سے نکل جانے کے بعد پروفیسر کلیم اللہ اس کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت دے دیتا ہے اور وہ کارخانے میں کام بھی شروع کر لیتا ہے۔ تو اس کے دل میں پروفیسر کلیم اللہ کی بیٹی نادرہ کے لئے محبت کے فطری جذبات پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک دن پروفیسر صاحب اس کو نادرہ کے ساتھ بوس و کنار کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ تو ایک رحم دل انسان ہونے کے باوجود ایک غیرت مند اور اپنی اولاد کے بارے میں حساس باپ بن کر اس کو بلا کر کہتا ہے:

> "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تم ابھی تک جرائم پیشہ ہو۔ اپنی بربادی کا انتقام تم معاشرے سے لو۔ تم مجھ سے اس کا بدلہ نہیں لے سکتے۔ ہرگز نہیں۔ تم سزا یافتہ ہو۔ جیب کترے ہو۔ اٹھائی گیرے ہو۔ میں تم کو ہرگز یہ حق نہیں دے سکتا کہ تم میری بیٹی کے ساتھ فلرٹ کرو۔ تم اور نادرہ مل کر مکمل اکائی نہیں بن سکتے۔ وہ خط مستقیم ہے اور تم خط مسخنی۔"(۱۱)

پروفیسر کلیم اللہ کے گھر سے ٹھکرائے جانے کے بعد نوشا نے کراچی کو چھوڑ کر اپنے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ لیکن اپنے شہر آکر نوشا کو جب شامی کی زبانی پتہ چلا کہ کس طرح نیاز نے اس کے گھر والوں کو برباد کر دیا ہے۔ اس کی ماں سے شادی کر کے اس کو مار دیا ہے اور اس کی بہن سلطانہ کو اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہے۔ جو کہ اب اس کے ناجائز بیٹے کی ماں بھی ہے اور اس کا چھوٹا بھائی نیاز کی جفاکاریوں اور سفاکیت سے تنگ آکر ہیجڑوں کی ٹولی میں شامل ہو گیا ہے۔ تو نوشا جذباتی ہو کر نیاز کو قتل کر دیتا ہے اور خود ایک بار پھر چودہ سال کے لیے جیل چلا جاتا ہے۔ قید کی سزا سننے کے بعد وہ اذیت، دکھ اور نااُمیدی و بے بسی کی انتہا پر پہنچ کر بار بار کہتا ہے:

"مجھے پھانسی دے دو۔
مجھے گولی مار دو۔
میں زندہ رہنا نہیں چاہتا۔
خدا کے لئے مجھے پھانسی دے دو!
جج صاحب! اللہ کے لئے مجھے پھانسی دے دو۔"(۱۲)

نفسیاتی طور پر جیل کے نام سے نوشا خوف زدہ ہو جاتا ہے کیونکہ اس کو پتہ ہے کہ جیل احساس جرم کو بیدار کرنے یا لوگوں کی اصلاح کرنے کی جگہ نہیں ہے۔ بلکہ مجرموں کو تیار کرنے ان کی تربیت کرنے کی جگہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

"وہ پہلی بار جیل گیا تو واپسی پر جیب کترا بن گیا۔ تب وہ صرف سال بھر کے لئے جیل گیا تھا۔ اب اسے چودہ سال کی سزا ملی تھی۔ چودہ سال کی طویل مدت میں وہ زیادہ بڑا اور زیادہ خطرناک جرائم پیشہ بن سکتا تھا۔ مگر وہ جرائم پیشہ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اس زندگی سے موت بہتر تھی۔"(۱۳)

راجہ اور نوشا کی طرح شامی بھی حالات کا ستایا ہوا ہے۔ وہ چھریرے جسم کا دبلا پتلا لڑکا ہے۔ اس کی آنکھوں میں شوخی وذہانت ہے۔ مزاج کا بھی تھوڑا گرم ہے۔ اس لئے جب راجہ تاش کا پتا اپنے پیروں تلے چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ تو شامی فوراً چلا کر کہتا ہے:

"دیکھ لیا۔ دیکھ لیا۔ سالے! یہ بے ایمانیاں کرتے ہو۔
راجہ اس کے احتجاج پر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔
ڈھٹائی سے بولا۔ ابے کچھ دماغ خراب ہو گیا ہے؟
۔۔۔۔۔ شامی کو تاؤ آ گیا۔ اس نے منہ بسور کر راجہ کی جانب دیکھا اور تڑ سے زناٹے کا ایک ہاتھ راجہ کے گال پر رسید کیا۔"(۱۴)

شامی کے والد کی ایک چھوٹی سی بساط خانے کی دوکان ہے۔ جس کی قلیل آمدنی سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ اس لئے گھر کے اخراجات پورا کرنے کے لیے وہ شامی کو اخبار فروشی کے دھندے پر لگا دیتا ہے۔ اس کا باپ ایک خونخوار اور ظالم وسفاک انسان ہے۔ وہ ہر بات پر شامی کو گالیاں دیتا ہے اور مارتا پیٹتا ہے۔ اس ذلت آمیز زندگی کی تلخی کو کم کرنے کے لیے شامی بھی اپنے دوستوں کے ساتھ آوارہ گردی کرتا ہے۔ لیکن راجہ اور نوشا کی طرح اس کو تاش کھیلنے اور فلم دیکھنے کے مواقع بہت کم ملتے ہیں کیوں کہ:

"وہ اپنے باپ سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈرنے کی بات ہی تھی۔ مار کے معاملے میں وہ بڑا جلاد تھا۔ جو چیز ہاتھ میں آتی کھینچ مارتا۔ کئی دفعہ اس کی مار سے شامی کا سر اور پیشانی لہولہان ہو چکے تھے۔"(۱۵)

اس کا باپ جلاد ہی سہی، لیکن وہ اپنے دوستوں کی طرح یتیم اور بے سہارا نہیں تھا۔ اس کے باپ نے اس کو بے لگام نہیں چھوڑا تھا۔ شامی کو اپنے گھر والوں سے اُنسیت ہے اس لئے وہ راجہ اور نوشا کے اسرار پر بھی انہیں چھوڑ کر کراچی نہیں جاتا۔ کیونکہ اس میں اپنوں سے دور رہنے کی ہمت نہیں تھی۔ باپ کی طویل بیماری اور موت کے بعد شامی کی زندگی انتہائی کٹھن ہو جاتی ہے۔ وہ دوکان بیچ

کر صبح اخبار بیچتا ہے اور رات کو سائیکل رکشہ چلاتا ہے۔ کیونکہ اس تن تنہا پر گھر میں سات کھانے والوں کا بوجھ ہوتا ہے۔ اس بوجھ نے اس کو نڈھال کر کے رکھا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہو گئی اور حالات کی ستم ظریفی سے وہ تپ دق جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی یاروں کا یار ہے اور دنیاداری نبھانے سے جی نہیں کتراتا:

"نوشا نے رکشا سے اتر کر شامی کو کرائے کا ایک روپیہ دینا چاہا تو اس نے خفا ہو کر گالی دی۔ منہ بگاڑ کر بولا۔ یار! تو کراچی سے چند ٹکے کمالایا تو مجھ پر رعب جھاڑ رہا ہے۔ یہ روپیہ اپنے پاس رکھ۔ صبح گھر آنا۔ دونوں ساتھ کھانا کھائیں گے۔"(۱۶)

نیاز بھی اس ناول کا اہم کردار ہے۔ یہ ایک ایسے غلیظ اور مکار شخص کا کردار ہے جو معاشرے کے لئے زہر قاتل ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے اور یہ تن تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد صرف دولت کا حصول ہے۔ چاہے وہ صحیح راستے سے ہو یا غلط۔ کہنے کو تو یہ کباڑ کا کاروبار کرتا ہے لیکن ساتھ ہی لوٹ کھسوٹ اور چوری کے مال کی خرید و فروخت کا دھندا بھی کرتا ہے۔ ناول کے آغاز ہی میں نوشا کو چوری کی ترغیب دیتے ہوئے ہمیں نیاز کی مجرمانہ ذہنیت کا انداز ہو جاتا ہے کہ کس طرح وہ اپنے فائدے کے لئے معصوم بچوں کی زندگی سے کھیلتا ہے۔ آگے جا کر اس کی یہ گھٹیا ذہنیت اور بھی واضح ہو جاتی ہے۔ جب وہ سلطانہ پر ڈورے ڈالتا ہے اور سلطانہ کے حصول کے لئے وہ اس کی ماں سے شادی کر لیتا ہے۔ شادی سے پہلے ہی وہ سوچ چکا ہوتا ہے کہ:

"وہ نوشا کی ماں سے نکاح کرے گا۔ پچاس ہزار روپے میں اس کا بیمہ بھی کرا دے گا۔ مگر سوال یہ تھا کہ اسے کس طرح راستے سے ہٹایا جائے تاکہ بیمے کی رقم جلد سے جلد مل جائے اور سلطانہ بھی اس کے قابو میں آجائے۔"(۱۷)

یوں اپنے اس گھٹیا اور سفاک منصوبے کی تکمیل کے لیے وہ ڈاکٹر موٹو جیسے ضمیر فروش ڈاکٹر کی مدد لے لیتا ہے اور سلطانہ کی ماں کو زہریلے انجکشن لگا لگا کر مار دیتا ہے۔ نیاز کی سفاکیت یہاں ختم نہیں ہوتی بلکہ وہ انو کو بھی راستے سے ہٹانے کے لیے ایسی وحشت ناک سزا دے دیتا ہے کہ انسانیت کانپ اٹھتی ہے:

"اس نے وحشیوں کی طرح جھپٹ کر دونوں ہاتھوں سے انو کے بال پکڑ لیے۔ کئی بار زور زور سے اسے جھنجوڑا اور پھر پوری طاقت سے دھکا دیا۔ وہ گیند کی طرح دیوار سے ٹکرا کر وہیں گر پڑا۔ نیاز نے قریب پہنچ کر اندھا دھند اس کی کمر پر، پیٹ پر، سینے پر لاتیں مارنا شروع کر دیں۔۔۔۔۔ وہ اس کے بھاری بھر کم جسم کے نیچے مچھلی کی طرح تڑپا۔ نیاز نے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ کر زور لگایا۔ انو کے حلق سے بلیوں کے غرانے کی سی آواز نکلی۔ اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔"(۱۸)

جیسے ہی انو نیاز کے اس ظلم و بربریت کی وجہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ تو نیاز نے فوراً ہی سلطانہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا دیا کیونکہ اب سلطانہ کی حفاظت کرنے والا کوئی ولی وارث نہیں تھا۔ اس لیے نیاز نے سلطانہ کو اپنی بیوی بنانے کے بجائے داشتہ بنا کر رکھ لیا اور وہ اس کے ناجائز بیٹے کی ماں بھی بن گئی۔ اب جب بھی سلطانہ اس سے اپنے نکاح کی بات کرتی تو وہ اس کو ٹال دیتا کیونکہ نیکی کرنا اور عزت دینا اس کی خصلت میں شامل نہیں تھا۔ شروع سے لیکر آخر تک نیاز کا کردار ایک ہوس پرست اور مفاد پرست انسان کا ہے۔ جب وہ خان بہادر کے لئے حکومت کو بوسیدہ کمبل مہنگے داموں میں فروخت کر دیتا ہے۔ تو خان بہادر اس کو گورنمنٹ کنٹریکٹر بنا دیتا ہے اور

اس کو کئی ٹھیکے دلوا دیتا ہے۔ اس میں بھی نیاز ہمیشہ ڈنڈی مارتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ راتوں رات امیر ہو جاتا ہے۔ لیکن آخر میں اپنے برے افعال کی وجہ سے نوشا کے ہاتھوں قتل ہو جاتا ہے۔

سلمان کا کردار نفسیاتی طور پر ایک الجھے ہوئے نوجوان کا ہے۔ ناول کے آغاز میں وہ ایک آوارہ مزاج طالب علم ہوتا ہے۔ تعلیم کی غرض سے وہ اپنے گھر سے دور اکیلا رہتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شرب نوشی جیسی بری عادت کا شکار ہو گیا تھا۔ سلمان کی شخصیت میں مستقل مزاجی نہیں ہے۔ وہ سلطانہ سے بہت محبت کرتا ہے لیکن پھر بھی اس سے شادی نہیں کرتا۔ وہ فلک پیما کارکن بن کر انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن خان بہادر کے حملے کے بعد وہ فلک پیما سے بھی کنارہ کشی کر لیتا ہے۔ سلطانہ سے عشق کرتا ہے لیکن رخشندہ سے شادی کرتے وقت اس کو سلطانہ کی یاد تک نہیں آتی۔ کیونکہ رخشندہ صوبائی اسمبلی کے ممبر کی بھتیجی ہے اور اس کے ذریعے سے سلمان کو جلد ترقی ملنے والی تھی۔ اپنی ترقی کے لئے پہلے وہ خود اپنی بیوی کو جعفری کے ساتھ تعلقات بڑھانے کا موقع دیتا ہے اور پھر رخشندہ اور جعفری کے بڑھتے ہوئے تعلقات سے خود ہی شدید اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لیکن اپنی بزدلی کی وجہ سے غیرت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے خاموشی سے اپنی بیوی کو طلاق دے دیتا ہے اور خود ان کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔

شوکت صدیقی نے سلمان کے ذریعے سے نوجوان نسل میں عزم وہمت کی کمی، احساس محرومی، مستقبل سے بے یقینی اور محنت سے عاری زندگی کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ وہ اپنی زندگی کا کوئی بھی فیصلہ یقین کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ اپنی کم ہمتی کی وجہ سے وہ کبھی کبھار خود ترسی کا شکار ہوتا ہے۔ اس لیے علی احمد جب ان سے اس کے مستقبل کی منصوبہ بندی کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ان سے یوں کہتا ہے:

> "اس معاشرے نے مستقبل کے بارے میں کوئی منصوبہ بنانے کا حق ہی کب دیا ہے۔ یہ حق تو زندگی میں صرف چند خوش نصیبوں کو حاصل ہے اور ان خوش نصیبوں کی فہرست میں میرا نام نہیں ہے۔"(۱۹)

خان بہادر استحصالی قوتوں کا ایک نمائندہ کردار ہے۔ یہ خاندانی رائیس ہے لیکن مال ودولت کا حرص پھر بھی اس کے دل میں موجود ہے۔ خان بہادر بھی نیاز کی طرح لالچی، خود غرض اور مفاد پرست انسان ہے۔ اپنے مفاد کے لیے وہ فلک پیما کے کارکنوں کو بھی اپنا آلہ کار بنانا چاہتا ہے۔ لیکن جب وہ ان کی بات ماننے سے انکار کر دیتے ہیں تو وہ ان کے ہیڈ کوارٹر پر حملہ کر کے ان کو شدید جانی ومالی نقصان پہنچا دیتا ہے۔ خان بہادر سیاسی داؤ پیچ خوب جانتا ہے۔ وہ ایک طرف شرافت کا لبادہ اوڑھ کر خدمت خلق کی آڑ میں عوام کو لوٹتا ہے۔ تو دوسری طرف وزارت حاصل کر کے حکومت کو لوٹتا ہے۔ اس کو لگام ڈالنے والا کوئی نہیں کیونکہ اس کے ہاتھ لمبے اور جڑیں مضبوط ہیں۔ یہ بظاہر ایک نیک اور شریف انسان ہے لیکن اس کے اندر ایک ایسا شیطان بستا ہے۔ جس کو اپنے فائدے کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔ اتنا امیر کبیر ہونے کے باوجود یہ سلطانہ سے اس کا آخری ٹھکانہ بھی چین لیتا ہے اور اپنے آدمیوں کے ذریعے اس کی عزت کو تار تار کر دیتا ہے۔ غرض یہ مجرمانہ ذہنیت کا حامل ایک مضبوط کردار ہے۔ اس کردار کے ذریعے شوکت صدیقی نے ہمارے ملک میں موجود ان سیاست دانوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو دونوں ہاتھوں سے عوام اور حکومت کو لوٹنے میں مصروف ہیں اور ان کو پکڑنے والا کوئی نہیں ہے۔

سلطانہ کا تعلق بھی غریب طبقے کی ان لڑکیوں میں سے ہے جو پیدا ہوتے ہی غربت اور محرومیوں کی چکی میں پستی ہے۔ سلطانہ بھی اپنے بھائی نوشا اور انو کی طرح تعلیم کے زیور اور دنیاوی آرام وآسائشوں سے محروم ہے۔ وہ بچپن ہی سے اپنی ماں کے ساتھ بیڑیاں

بناتی ہے تا کہ اس کی آمدنی سے گھر کے اخراجات پورے ہو۔ ایک دن جب نیاز گھر کا کرایہ لینے کے لئے ان کے گھر آجاتا ہے۔ تو وہ سلطانہ کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ سلطانہ کے قریب رہنے کے لیے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ وہ سلطانہ کی ماں سے شادی تو کر لیتا ہے۔ لیکن پھر بھی وہ سلطانہ کو میلی نظروں سے دیکھنا نہیں چھوڑتا۔ سلطانہ جب اس کی گندی نظروں کا مطلب جان لیتی ہے۔ تو وہ اس سے خوف زدہ رہنے لگتی ہے:

"سلطانہ سر جھکا کر پان لگانے لگی۔ وہ اس سے نظریں ملاتے ہوئے ڈرتی تھی۔ اس نے جب بھی اس کی جانب دیکھا اسے نیاز کی آنکھوں میں شکار پر جھپٹنے والے تیندوے کی سی تیز چمک نظر آتی۔ وہ نامعلوم خوف سے تھرا کر رہ جاتی۔"(۲۰)

سلطانہ مجبور، بے بس اور محبت کو ترسی ہوئی لڑکی ہے۔ اس لئے اس کو جہاں بھی کوئی سہارا نظر آتا ہے وہ اس کی طرف جھکتی چلی جاتی ہے۔ کبھی سلمان سے محبت کا دم بھرتی ہے۔ تو کبھی شاہد سے محبت کی امید لگا بیٹھتی ہے۔ لیکن سچی محبت اس کے نصیب میں نہیں تھی۔ اس لئے وہ ہمیشہ خالی ہاتھ رہ جاتی ہے اور در در کی ٹھوکر کھاتی ہے۔ ماں کی وفات کے بعد جب نیاز اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنالیتا ہے اور وہ اس کے ناجائز اولاد کی ماں بننے والی ہوتی ہے۔ تو بچے کی پیدائش سے پہلے ہر باحیا لڑکی کی طرح وہ بھی سوچتی ہے:

"وہ اسے ماں کی مامتا نہ دے سکے گی۔ سلطانہ کو اس کے خیال ہی سے نفرت ہوتی تھی۔۔۔۔۔ وہ جل کر کبھی کبھی اسے کوسنے لگتی۔ یا اللہ! یہ حرامی پیدا ہوتے ہی مر جائے۔"(۲۱)

بچے کی پیدائش کے بعد نفرت پر مامتا کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ اب سلطانہ ننھے ایاز کو دیکھ دیکھ کر جیتی ہے اور ہر وقت اس کے کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتی ہے۔ نیاز کے قتل کے بعد جب خان بہادر کے غنڈے سلطانہ کو اپنی ہوس کا نشانہ بنالیتے ہیں اور ننھے ایاز کو قتل کرنے کا منصوبہ بنالیتے ہیں۔ تو سلطانہ ایاز کی جان بچانے کے لیے بوڑھے خانساماں کے بھائی کے گھر آجاتی ہے۔ لیکن یہ لوگ بھی اس کو زیادہ عرصے تک برداشت نہ کر سکے اور یوں وہ در در کی ٹھوکریں کھاتے ہوئے سکائی لارکوں کے دفتر پہنچ گئی اور اس تنظیم کا حصہ بن گئی۔ یہاں آکر سلطانہ کے دل میں بھی ایک بار پھر اپنی قسمت کو بدلنے کی چاہت پیدا ہو گئی اور اس نے علی احمد سے شادی کر لی۔ جس سے اس کو اور اس کے بیٹے کو ایک محبت بھرا سہارا مل گیا۔ سلطانہ سراپا صبر تھی وہ ہر طرح کے اذیت ناک حالات کو بھی صبر کے ساتھ برداشت کرتی تھی کیونکہ اس کے اندر احتجاج کرنے اور اپنی مدافعت کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس لئے علی احمد بھی اس کو دیکھ کر اس کے ضبط کے بارے میں سوچتا ہے کہ:

"واقعی یہ لڑکی مصیبت زدہ ہے۔ وہ ربڑ کے گیند کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ جا کر گر رہی تھی اور ہر جگہ اس پر ٹھوکر لگائی جا رہی تھی۔ یہ عجیب معاشرہ ہے جہاں عورت ربڑ کی گیند اور خوبصورتی چوری کا مال بن جاتی ہے۔"(۲۲)

سلطانہ کے علاوہ اس کی ماں کا کردار بھی نفسیاتی حوالے سے بہت اہم ہے۔ غربت اور جوانی میں بیوگی نے اس کو وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ سلطانہ کی ماں بھی حالات کی ستائی ہوئی ہے۔ سلطانہ کے ساتھ مل کر وہ ایک کارخانے کے لیے بیڑیاں بناتی ہے اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہے۔ آخر غربت اور پریشانیوں سے مجبور ہو کر نیاز جیسے گھٹیا شخص سے شادی کر لیتی ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کے لیے یہی ایک راستہ نظر آیا۔ شادی کے بعد جب اس کو محسوس ہو جاتا ہے کہ اس کا شوہر سلطانہ کو میلی نظروں سے

دیکھ رہا ہے تو وہ بھی ہر ماں کی طرح اپنی بیٹی کو اس کی ہوس کا نشانہ بننے سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ وہ خود سلمان سے کہہ دیتی ہے کہ وہ اس کی بیٹی کو اپنالیں اور جب سلمان کی طرف سے مایوس ہو جاتی ہے تو ایک اور جگہ اس کا رشتہ طے کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن تب تک اس کی زندگی وفا نہیں کرتی اور نیاز کے لگائے ہوئے زہریلے انجکشن کی وجہ سے مر جاتی ہے۔ یہاں اس کی بد نصیبی اور بے بسی کی انتہا ہو جاتی ہے اور اس کے بچوں کی بد قسمتی کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ غرض اس ناول کا ہر کردار کئی نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہے۔ ہر کردار اپنی جگہ پر مجبور، بے بس اور حالات کا ستایا ہوا ہے۔ جب کہ نیاز، شاہ جی اور خان بہادر جیسے بھیڑیئے اس بستی میں آزادی کے ساتھ گھوم رہے ہیں کیونکہ اس معاشرے میں مجرم آزاد اور معصوم لوگ سزا بھگتتے ہیں۔ اس سماج میں موجود عوام و خواص کے درمیان اس فرق کو شوکت صدیقی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> "نوشا جیل میں تھا اور خان بہادر فرزند علی کے فرزند ارجمند بیرونی ممالک میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اپنے مستقبل کی روشن صبح کی دہلیز پر کھڑے تھے۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ یہ خواص اور عوام کی قسمت کا فرق ہے۔ خواص، خان بہادر فرزند علی پیدا کرتے ہیں اور عوام نوشا، راجہ، شامی اور انو کو جنم دیتے ہیں۔ ان میں کوئی قتل کر کے جیل جاتا ہے۔ کوئی کوڑھی بن کر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر موت کا انتظار کرتا ہے۔ کوئی رکشا کھینچتا ہے اور تپ دق میں مبتلا ہو کر خون تھوکتا ہے اور کوئی ہیجڑوں کے ساتھ تالیاں پٹخار کر کولہے مٹکاتا ہے۔" (۲۳)

یہ تمام عوامل فسادات کے بعد بننے والے نئے اور تباہ حال معاشرے کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں اور اس وقت کے لوگوں کے ذہن و نفسیات کا ماہرانہ تجزیہ کرتے ہیں۔ بقول نگینہ جبین:

> "یہ ناول پاکستان کے عوام کی نفسیات اور اس کے طرز زندگی پر تقسیم کے بعد جو اثرات مرتب ہوئے ان کا بڑی مہارت سے احاطہ کرتا ہے اور پھر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر تقسیم نہ ہوتی تو ایک بسی بسائی بستی کو اجاڑ کر نئی بستی نہ بسائی جاتی تو شاید راجہ، نوشا، انو، شامی جیسے کردار نہ پیدا ہوتے۔" (۲۴)

اس طرح ناول نگار نے ان کرداروں کے ذریعے معاشرتی استحصال اور عدم مساوات کی وجہ سے معصوم بچوں کی زندگیوں کو جہنم بنتے ہوئے دکھایا ہے جیسے راجہ، نوشا، شامی، سلمان، انو اور سلطانہ کی تباہی اور بے راہ روی کے ذمے دار لوگوں سے پردہ اٹھایا ہے اور یہ بتایا ہے کہ کس طرح جب معاشرہ شریف اور معصوم لوگوں کو جینے نہیں دیتا تو وہ نفسیاتی توڑ پھوڑ کا شکار ہو کر مجرم بن جاتے ہیں۔ آج بھی یہ کردار زندہ اور ناقابل فراموش ہیں کیونکہ آج بھی ہمارے معاشرے میں عدل و انصاف کی کمی، عوام کا استحصال اور جبر اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ آج بھی عوام کے بچوں کے ہاتھ میں قلم تھمانے کے بجائے ان کو غربت و افلاس کی چکی میں پیس کر انہیں ذہنی مریض بنایا جا رہا ہے۔ خدا کی اس بستی کا آج بھی کوئی ناخدا نظر نہیں آتا۔

حوالہ جات

۱۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اور پاکستان، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص:۴۶

۲۔ عبدالکریم خالد، ممتاز مفتی کے افسانوی ادب میں نفسیات نگاری، مقالہ برائے پی۔ ایچ۔ ڈی (اُردو)، جامعہ پنجاب، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص:۶۶

۳۔ نئی قدریں، حیدرآباد، خاص شمارہ، ۱۹۷۵ء، ص:۲

۴۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۱۵ء، ص:۷

۵۔ ایضاً، ص:۷

۶۔ ایضاً، ص:۹۳

۷۔ ایضاً، ص:۹۴

۸۔ ایضاً، ص:۹۷-۹۲

۹۔ ایضاً، ص:۳۳-۳۲

۱۰۔ ایضاً، ص:۸۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۴۰۰

۱۲۔ ایضاً، ص:۴۷۹

۱۳۔ ایضاً، ص:۷۹

۱۴۔ ایضاً، ص:۸-۷

۱۵۔ ایضاً، ص:۲۳

۱۶۔ ایضاً، ص:۴۰۸

۱۷۔ ایضاً، ص۸۴:-۸۳

۱۸۔ ایضاً، ص:۳۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص:۱۶۳

۲۰۔ ایضاً، ص:۲۲۸

۲۱۔ ایضاً، ص:۳۹۴

۲۲۔ ایضاً، ص:۴۴۷

۲۳۔ ایضاً، ص:۴۷۷

۲۴۔ مقالہ نگار، زیبا ترنم، شوکت صدیقی کی فکشن نگاری کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ (یو۔پی) انڈیا، ۲۰۱۴ء، ص:۱۵۶